ہندوستان میں تاریخ دعوتِ اسلامی کا ایک باب

تحریک نظم جماعت

مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

بجناب ابو سلمان شاہجہانپوری

حضرت اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی (رحمۃ اللہ علیہما) کی تحریک جہاد اور اسلامی نظام حکومت کے قیام کی مساعی کی ناکامی[1] کے بعد مولانا ابو الکلام آزادؒ کی دعوت قیام نظام جماعت، برصغیر ہند

---

[1] یہاں جو ناکامی کا لفظ اختیار کیا گیا تو یہ لغوی معنی میں ہے حقیقت میں ناکامی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اسلامی نقطۂ نظر سے توان ارواحِ مقدسہ کی کامیابی کے لیے یہ بات بس کرتی ہے کہ انہوں نے خالصاً لوجہ اللہ مسلمانوں کے دینی و ملی مفاد کے تحفظ و بقا کے لیے قدم اٹھایا اور اپنے پورے وسائل کو بروئے کار لاکر، اپنی پوری صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنی جان اور اپنے مالوں کی پرواہ نہ کر کے، زندگی کی عشرتوں اور راحتوں کو تج کر، پورے اخلاص کے ساتھ، پوری مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ، انسانی سعی و جہد کے آخری مراحل تک جا کر اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کی ان سے توقع کی جائے؟ جنہوں نے مقیم زندگی کی آسائشوں کی بجائے مسافرت کی تکالیف کو اختیار کر لیا ہو۔ گھر کی عشرتوں کی بجائے میدان جہاد کی مشقتوں کو اور نرم و گداز بستروں کی جگہ پتھریلے فرش میں اپنی راحتِ دل و جان کا سامان ڈھونڈا ہو۔ جن کی نگاہوں کو میدانِ جہاد کا خونین منظر گل و گلشن کی رنگینیوں اور دل کشیوں سے زیادہ محبوب ہو جنہوں نے صرف رضائے الٰہی کے لیے دیبا و حریر کی پوشاکوں پر میلی کچیلی مگر خونِ شہادت کے چھینٹوں سے آلودہ قباؤں کو ترجیح دی ہو۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کا ان سے مطالبہ کیا جائے۔ جن کے لیے پہلی ہی بشارت سنا دی گئی ہو کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الآیۃ

(باقی اگلے صفحہ پر)

پاکستان میں پہلی اسلامی تحریک تھی جو حالات و مصالح وقت کی پوری بصیرت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے تحفظ کے لیے دی گئی تھی جس میں مسلمانوں کے امراضِ اجتماعی کی صحیح تشخیص کی گئی تھی اور ان سے نجات کے لیے علاج اور طریق علاج بھی صحیح تجویز کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی حالت

مولانا آزاد نے یہ دعوت اب سے نصف صدی پہلے دی تھی۔ اس مدت میں دنیا میں اور خود اس برصغیر پاک و ہند میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہو چکے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق پڑ چکا ہے۔ پہلے وہ ایک محکوم قوم تھے۔ آج وہ حکومت و اقتدار میں برابر کے شریک ہیں لیکن اس انقلاب عظیم کے باوجود وہ جماعتی زندگی کی اس معصیت میں مبتلا ہیں جس سے نجات کے لیے مولانا آزاد نے نظم جماعت اور امارتِ شرعیہ کا نسخہ شفا تجویز کیا تھا اور اگر یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو جماعتی زندگی کی اس معصیت سے نجات نہیں ملی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آج بھی اس کے سوا کوئی اور نسخہ شفا اور راہِ فوز و فلاح نہیں۔ اگر وہ بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اپنے ملی وجود کو قائم رکھنے اور ملک کی سیاست میں اپنے آپ کو ایک فعال اور مؤثر قوت ثابت کرنے کے خواہاں ہیں تو انہیں نظم جماعت کے قیام سے مفر نہیں۔

پاکستان میں روزِ اول سے اگرچہ مسلمان حکومت قائم ہے لیکن صحیح اسلامی زندگی سے یہاں بھی اتنی ہی دوری ہے جتنی ہندوستانی مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں میں افتراق و تشتت کی حالت اس سے زیادہ شدید ہے۔ آج کل خاص طور پر انتشار کی یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور یہ اس بات کی

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ان کے لیے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوگی کہ وہ اپنے عہد میں پورے اترے اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا مقام محبوبیت حاصل کر لیا۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا!

ناکامی کا داغ ان کے لیے کیوں ہوتا؟ یہ ذلت تو ان کے لیے ہے جن کی نیتیں اخلاص و للہیت سے تہی ہیں جن کے قلوب عزم امور کی حلاوت سے ناآشنا ہیں اور جو اپنے پائے اقدام وسعی فی سبیل اللہ کو توڑ بیٹھے ہیں۔

دلیل ہے کہ اس دعوت کی جس طرح ہندوستان میں آج بھی ضرورت ہے اسی طرح پاکستان میں بھی فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ ضرورت مستقل ہوگی۔ پاکستان میں "صحیح اسلامی حکومت" کے قیام تک اس کی ضرورت بہرصورت ہے۔ صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے بعد اس دعوت کا مقصد بطریق احسن پورا ہو جائے گا۔ فی الحال اس دعوت اور تحریک کی ضرورت کے دونوں ملکوں میں ہے اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا ایک ملی معصیت ہے۔ لیکن یہاں میرا مقصد دعوت نہیں صرف تاریخی تذکرہ مقصود ہے۔

مولانا نے جب یہ دعوت دی تو ہندوستان میں مسلمانوں میں نہ کوئی رشتہ انسلاک تھا، نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ تھا۔ نہ ان کا کوئی قائد اور امیر تھا اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع محض ایک بھیڑ تھی، ایک انبوہ تھا۔ ایک گلہ تھا جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا تھا اور ایک حیات غیر شرعی و جاہلی تھی جس میں پوری اقلیم مبتلا تھی۔

ان حالات میں مولانا نے نظم جماعت کی ضرورت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو اس کے قیام و اختیار کی دعوت دی۔

نظم جماعت سے مقصود

نظم جماعت سے مراد یہ تھی کہ تمام لوگ احکام نظم شرع کے مطابق ایک صاحب علم و عمل مسلمان امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع ہو جائیں۔ وہ ان کا امام ہو وہ جو تعلیم دے ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں اور قرآن و سنت کے ماتحت مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے لیے اس کے جو احکام ہوں ان کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

مسئلے کے مختلف پہلو

مسئلہ نظم جماعت کے کئی پہلو اور اس کی کئی حیثیتیں ہیں:

اولاً۔ اس کی اسلامی و شرعی حیثیت یعنی مسلمان خواہ کسی ملک کے باشندے ہوں، ان کا گرد و پیش ایک دوسرے سے خواہ کتنا ہی مختلف ہو اور ان کی دستوری و سیاسی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو ان کے لیے نظم جماعت کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کے ترک و اختیار کا شرعی حیثیت سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

ثانیاً۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مخصوص حالات اور سیاسی گرد و پیش میں، اگر مسلمان بحیثیت ایک مسلم وحدت کے زندہ رہنا اور اپنا اسلامی و ملّی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس مسئلے کی اہمیت کیا ہے؟

ثالثاً۔ ہندوستان کے خاص حالات میں اگر مسلمان ایک متحدہ سیاسی قومیت کے اہم عنصر کی حیثیت سے قومی و ملکی فرائض و حقوق کی منزلوں سے گزرنا۔ سیاسی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینا، ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت میں ہندوستان کے مطلع سیاست پر ابھرنا اور معاشی و اقتصادی دوڑ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو نظمِ جماعت کا قیام ان کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؟

رابعاً۔ اگر ہندوستان کے مسلمان نظمِ جماعت قائم کر لیتے ہیں تو ان کا یہ عمل صالح مسئلہ خلافت، اور مسلمان ملکوں کی سیاست میں اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں کس درجہ مفید اور انفع ہوگا؟

مولانا نے مسئلے کے ہر پہلو پر اس کی اہمیت کے مطابق بحث کی ہے یا کم از کم ضروری اشارات کیے ہیں اور اہل علم و اصحاب نظر کو توجہ دلائی ہے۔

نظامِ جماعت کی شرعی حیثیت

یہ مسئلہ اپنے تمام پہلوؤں اور اپنی تمام حیثیتوں سے مسلمانوں کے تمام اعمال و اقدام کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے ہے۔ اسلام اور اسلامی زندگی کی تمام برکات و حسنات نظامِ جماعت سے وابستہ ہیں اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی حیاتِ جاہلی و غیر شرعی ہے جسے وہ گزار رہے ہیں مسئلے کی اسلامی و شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:۔

"اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمالِ حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی فرادیٰ، متفرق، الگ الگ اور تشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع، متالف، متحد اور کنفیس واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا ہے اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جس قدر تفرقہ و تشتت سے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ مرکز و محور کے قرار پائی اور تمام دائرۂ عمل اس کے گرد قائم کیا گیا۔ عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقتِ مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے اور

اس بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا ہے کہ :-

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَ السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ" [1]

اور :-

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فان الشيطن مع الفذ وهو من الاثنين ابعد" [2]

اور :-

"اذا كان ثلث فى سفر فليؤمروا احدكم" [3]

اور اسی لیے نظم و قوام ملت کے لیے منصب خلافت کو قرار دیا گیا ہے کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں"

ہندوستان کے مسلمان اور مسئلہ نظم جماعت۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مسئلہ نظام جماعت کی اہمیت یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی حیات انفرادی کو ترک کرکے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں اور بکھرے ہوئے منتفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ مولاناؒ کے نزدیک تمام اعمال اصلاحیہ اور تمام مقاصد اصلاح و مصالح انقلاب کا نفاذ و نفوذ اسی کے قیام و وجود پر موقوف تھا۔ اس کے بغیر نہ تو احیاء و تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی راہ بیدار ہوسکتی تھی۔ نہ ملکی سیاست اور آزادی کی جد و جہد میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور نہ بحیثیت جماعت کے اپنی ہستی برقرار رکھ سکتے تھے۔

" مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصے سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں"

---

[1] رواہ الترمذی [2] رواہ البیہقی [3] رواہ اصحاب السنن

جماعتی زندگی کی معصیت سے مولاناؒ کی مراد یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔

مولانا کے پیش نظر اس کا سیاسی پہلو بھی تھا اور اس کی اہمیت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ نظام جماعت کے قیام سے غفلت نہ برتی جائے۔ اس بارے میں انہوں نے صاف صاف اپنے اس یقین کا اعلان کیا کہ راہ شرعی صرف ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی۔ ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

"۱۹۱۲ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہو گا ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہیں ہو گی۔ چنانچہ اس وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔"

خصائص منصب امامت

جس طرح مسئلہ نظم جماعت و امامت چند اصول و مقاصد سے مرکب ہے۔ اس طرح منصب امامت بھی اپنے لیے چند خصائص و اوصاف کا متقاضی ہے۔ ہر عالم دین اس کا اہل اور ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس نہیں ہو سکتا۔ مولانا آزادؒ نے منصب امامت کے خصائص و شرائط پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحے کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوے شرع صادر کرتا رہے۔"

ایک اور جگہ اس منصب کے خصائص پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:۔

"آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے تمام اسرار و غوامض اور معالجۂ امراض اور طبابت عہد و ایام کے تمام سر اثر و فضایا اس طرح کھول دے کہ

صرف ایک صحیفہ کتاب وسنت اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے اور ارواح وقلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے ۔"

نظم جماعت کے قیام کی کوشش

اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۹۱۴ء میں مولانا بعض علماء سے خود ملے اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو بھیجا لیکن علمائے وقت نے عام طور پر اس مسئلے کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اعراض و انکار سے کام لیا۔ البتہ جب مولانا آزادؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے ملاقی ہوئے اور انہیں عزائم ومقاصد کی طرف توجہ دلائی تو حضرت مرحوم نے پہلی ہی صحبت میں اس سے کامل اتفاق ظاہر فرمایا۔

ترجمان القرآن میں سورۃ توبہ کی ایک آیت پر نوٹ میں فرماتے ہیں :-

"۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا۔ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم ومقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحابِ رشد وعمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے ...... یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔"

مولانا محی الدین قصوری کے نام ایک خط میں بھی مولانا نے اپنی ان کوششوں، علماء سے اپنی ملاقاتوں اور ان کے مایوس کن جواب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت شیخ الہند

مولانا آزادؒ کے نزدیک حضرت شیخ الہند کی مستثنیٰ شخصیت کے سوا ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس مسئلے کی اہمیت وحقیقت اور منصبِ امامت کے فرائض ومہمات اور پھر موقتہ حالات کی بنا پر مشکلات وصعوباتِ راہ کا نکتہ شناس ہو۔ علمائے متاخرین میں حضرت شیخ الہند کی دعوت وعزیمت کا مولانا آزادؒ نے نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ ابھی چند سطریں پہلے منصبِ امامت کے خصائص وشرائط کا تذکرہ آیا تھا۔ چونکہ اس منصب کے لیے مولانا آزاد کی نظرِ انتخاب حضرت شیخ الہند پر پڑی تھی، اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی سیرت کے خصائص وکمالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جاتی۔ نظر ومطالعے کی اس ضرورت کے لیے مولانا آزاد ہی کا بیان کفایت

کرتا ہے۔

"مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دور کے علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس دورِ حرمان و فقدان میں علمائے حق کی اوصاف و خصائص کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر سال کی عمر میں جب ان کا قدان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا۔ عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انہیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام و ملتِ اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انہوں نے اعدائے حق کی مرضات و ہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔

فی الحقیقت انہوں نے علماءِ حق و سلف کی سنت تازہ کر دی اور علماءِ ہند کے لیے لیے اپنی سنت حقہ یادگار چھوڑ گئے۔"

یہ تھی ہندوستان کی وہ بزرگ ترین ہستی جو مولانا کے نزدیک منصب امامت کی اہل تھی۔ حضرت شیخ الہند مولاناؒ کے اصرار پر یہ منصب قبول کر لینے پر آمادہ بھی ہو گئے تھے اور یہ بات طے پا گئی تھی کہ ہندوستان میں نظمِ جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند نے سفر حجاز کا ارادہ کر لیا اور مولانا آزاد کے بقول "میری کوئی منت و سماجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی"۔ اس صورت میں کہ مولاناؒ جس شخصیت کو اس منصب کے لیے اہل اور مستحق سمجھتے تھے، درمیان میں موجود نہیں تھی اس امر عظیم کو ترک کر دیا جا سکتا تھا نہ التوا میں ڈالا جا سکتا تھا۔ مولانا نے اپنی ذمہ داری پر کام جاری رکھا۔

مولانا کی نظر بندی

اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ملا۔ مجبوراً وہ رانچی چلے گئے۔ بعد میں وہیں انہیں نظر بند کر دیا گیا اور اس طرح کام کا نقشہ یکسر پلٹ گیا۔ اور اگرچہ حوادث کی ہوش ربائی اور واقعات کی الم ناکی انتہا درجہ کی تھی لیکن مولانا کی عزیمت و استقامت کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مولانا کا ذہن و دماغ امید کی شمع جلائے کام کے لیے نقشے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "پیغام" کے مقالہ

افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:۔

"عین ۱۹۱۸ء کے اواخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آرزؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گزر چکا تھا، تو میں رانچی کے گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا، ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سر و سامان دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔

تفاوت است میان شنیدن من و تو

تو بستن در و من فتح باب می شنوم

۱۹۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں کہ جب میں نے انہی ہاتھوں سے امیدوں اور آرزؤں کے نئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں، جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا۔"

نیا نقشۂ کار

اس نئے نقشۂ کار کے مطابق مولانا کے پیش نظر تین بڑے مقاصد و مہمات تھے۔

۱۔ رفقاء و طالبین کی ایک جماعت کی تعلیم و تربیت

۲۔ تصنیف و تالیف

۳۔ جماعتی اعمال یعنی تنظیم جماعت

ان میں سے طالبین حق کی تعلیم و تربیت کا کام قید سے رہائی اور آزادی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا لیکن دوسرے امور پر انہوں نے اسی زمانے میں توجہ دی چنانچہ ان کے اوقات نظر بندی کا بڑا حصہ اپنے افکار کی ترتیب و تالیف میں بسر ہوا۔ امر ثالث پر عمل کے لیے بھی نقل و حرکت کی آزادی کی ضرورت تھی لیکن ایام نظر بندی میں بھی جس حد تک حالات نے اجازت دی ان سے فائدہ اٹھانے میں غفلت نہیں کی۔ چنانچہ صوبہ بہار کے احباب و مخلصین کو جن سے اس زمانہ میں بھی ربط تھا۔ مولانا نے توجہ دلائی اور کام کی ابتداء کر دی۔

رہائی کے بعد کوشش

جنوری ۱۹۲۰ء میں مولاناؒ رہا ہوئے تو ان کے پیش نظر کاموں کا یہی نقشہ تھا اور وہ اسی میں مصروف رہنا چاہتے تھے لیکن حالات کی نزاکت اور ملکی اور ملی مقاصد کی ناگزیر احتیاجات کی وجہ سے مولاناؒ کو وقت اور ضرورت کے مطابق فیصلہ کر لینا پڑا۔ اس حالت میں قرار داد اسلوب عمل کی پہلی شقوں پر تو عمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن تنظیم جماعت کا کام جاری رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ تحریک خلافت کے ساتھ تنظیم جماعت کے کام کو آگے بڑھانے اور تمام صوبوں تک اس دعوت کو پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مخلصین اور علمائے کرام کو اس طرف توجہ دلائی اور وسط سال تک وہ پورے ملک میں نظم جماعت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف دائرہ عمل کی توسیع کا مرحلہ باقی رہ گیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام ۱۳ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"گزشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئی گیا تھا تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار کر لیں ..... بحمداللہ معاملہ تنظیم جماعت من کل الوجوہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات و تفصیلات بھی طے پا گئیں۔ اب بجز توسیع دائرہ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے اور وہ توفیق الٰہی پر موقوف ہے ..... بہرحال دائرہ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب سندھ، بنگال بالکل متفق و متحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔"

صوبوں میں تنظیم جماعت

اس وقت مختلف صوبوں میں تنظیم کی صورت یہ تھی۔

۱۔ پنجاب میں مولانا داؤد غزنوی امرتسری اور مولانا عبداللہ قصوری علیہما الرحمۃ اور مولانا محی الدین احمد قصوری مدظلہ، مولاناؒ کے خلفائے مجاز اور تنظیم جماعت کے کاموں کے ذمہ دار تھے۔ مولانا سید داؤد غزنوی پنجاب میں علمائے اہل حدیث کے گل سرسید اور علمائے سلف کی آخری یادگار تھے۔ مولانا عبداللہ مرحوم مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی تھے اور مولانا محی الدین قصوری ان (مولوی عبدالقادر) کے بیٹے تھے۔ یہ خاندان پنجاب میں اپنی دینی دنیوی خدمات اور علم و فضل کی وجہ سے نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ سندھ میں پیر سید تراب علی شاہ راشدی مولانا کے خلیفہ مجاز اور تنظیم جماعت کے کاموں کے ذمہ دار

تھے۔ پیر صاحب مرحوم ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں "قنبر علی خاں" کے رہنے والے تھے اور اپنی دینداری اور قومی خدمات کے لیے کافی مشہور تھے۔

۳۔ یوپی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مامون و مامور تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر کام شروع کیا اور چند ماہ کے اندر تنظیم جماعت کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ مرحوم اپنے جذبات صادقہ اور جوشِ عمل کی بنا پر بڑی خصوصیت رکھتے تھے [1]

۴۔ صوبہ بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں خود مولانا کی ذاتِ گرامی دعوت اور تنظیم جماعت کے کاموں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور وہ خود سرگرمی کے ساتھ بیعت و ارشاد کے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا کے سوا کسی ماذون و مجاز کا پتہ نہیں چل سکا لیکن ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد منیر الزمان اسلام آبادی امارتِ شرعیہ اور نظمِ جماعت کے قیام کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ شاید وہ مولانا کی جانب سے ماذون و مامور ہوں۔ اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ مولانا سجاد بہاری سے ان کے قریبی تعلقات بلکہ عقیدت کیشی اور نیاز مندی کے تعلقات تھے۔

۵۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم بہار میں تنظیمِ جماعت اور امارتِ شرعیہ کے قیام کے لیے مولانا کی جانب سے مامور تھے۔ مولانا آزادؒ سے ابو المحاسن کے تعلقات معلوم و مشہور ہیں۔ مولانا آزادؒ نے انہیں اپنے مخلصین و محبین میں شمار کیا ہے۔ انہی کی کوششوں سے صوبہ بہار میں امارت شرعیہ اور نظمِ جماعت کا قیام سب سے پہلے عمل میں آیا اور ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء بہار کے جلسے میں تین سو علماء نے بالاتفاق حضرت مولانا سید بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امیر شرع منتخب کر لیا۔

چند مریدین مخلصین

مولانا کے ان خلفائے مجاز کے علاوہ سینکڑوں مرید تھے ان میں سے جن کے نام معلوم ہو سکے

---

[1] لکھنؤ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو چند ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں انہوں نے کرسچین کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے طلبہ، مولوی گنج کے بہت سے مسلمانوں اور درپر گنج کے کچھ اطبار کو حلقہ بیعت میں داخل کیا۔ جن کی مجموعی تعداد کئی سو تھی۔ ان میں سے گولہ گنج کے منے خاں، ظفر الملک مولوی اسحاق ایڈیٹر الناظر کے بڑے بھائی مولوی شفاعت علی اور ملیح آباد کے سردار محمد خان کے نام معلوم ہوئے ہیں۔

یہ ہیں:

۱۔ خواجہ عبدالحی فاروقی ۲۔ مستری محمد صدیق مرحوم (کپورتھلہ)
۳۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (امرتسر) ۴۔ شیخ قمرالدین مرحوم (لاہور)
۵۔ مولانا غلام رسول مہر (لاہور) ۶۔ غالباً سب سے آخری شخص جنہوں مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مولوی محمد یونس خالدی (لکھنو) ہیں۔

میثاقِ اسلامی

جب کوئی صاحب اخلاص مسلمان جماعتی زندگی کی اہمیت کو سمجھ لیتا اور نظمِ جماعت کا پابند اور احکام شرعیہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر صدقِ دل سے آمادہ ہو جاتا تو مولانا اس سے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق ایک عہد لیتے تھے۔ یہ عہد خانقاہی نظام اور تصوف کے کسی خاص سلسلے کے اعتقاد و وابستگی کا عہد نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے اخلاص نیت کے ساتھ احکامِ شریعت کے کامل اتباع پوری زندگی کو مرضیاتِ الٰہی کے حوالے کر دینے اور اپنے تمام مالوفات، مطلوبات اور تمام تعلقوں اور رشتوں سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو اور اپنے تمام ذاتی و انفرادی مفادات کے مقابلے میں اجتماعی اور امت کے مصالح کو زیادہ عزیز و مقدم رکھنے اور اس کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کا عہد ہوتا تھا۔

اس سلسلے میں مولانا کی دو تحریریں پیش نظر ہیں۔ ایک تحریر ۱۹۲۱ء کی ہے اور "مولانا ابو الکلام آزاد کا پیام عزیزانِ پنجاب کے نام" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے یہ نایاب تحریر "نقشِ آزاد" میں شامل کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کر دی ہے۔ دوسری تحریر بیعت کا وہ مسودہ ہے جو مولانا نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھ کر دیا تھا چونکہ پیش نظر مقصد کی وضاحت کے لیے ایک تحریر کفایت کرتی ہے۔ اس لیے یہاں دوسری تحریر نقل کی جاتی ہے۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاٰمَنْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَسْلَمْتُ وَاَقُوْلُ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء و نائبین کے اس بات پر کہ:

۱۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۲ پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۳۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کرونگا۔

۴۔ میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے، اپنے مال سے، اپنے اہل وعیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب وسنت کے مطابق دیا جائے گا سمع و الطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔"

شیخ الہند کی ہندوستان واپسی

مارچ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کو مالٹا کی نظر بندی سے رہائی ملی اور جون میں وہ ہندوستان پہنچے لیکن نظر بندی کے زمانے کی سخت تکالیف سے ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۹ برس کی تھی۔ اگرچہ ان کے دل میں کبھی نہ بجھنے والی ایمان کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لیکن ان کا جسم امت کے غم میں گھل چکا تھا۔ قویٰ جواب دے چکے تھے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ کوئی ذمہ داری اٹھائیں۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد وہ تقریباً چھ ماہ زندہ رہے یہ مدت بھی عوارض ومعالجات کی فکروں میں گزری [1]

---

[1] ہندوستان تشریف لانے کے بعد حضرت شیخ الہند کی صحت اور ان کے شب و روز کے مشاغل کے بارے میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب فرماتے ہیں۔ "حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مرض الموت کا آغاز تھا۔ آپ کو وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرتِ بول کی شکایت بھی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے باوجود حلقہ دیوبند کے بعض حضرات کی نہایت مخلصانہ خواہش تھی کہ حضرت شیخ الہند اس منصب کو قبول فرمالیں۔ دوسری طرف حلقہ فرنگی محل مولانا عبدالباری کی امامت کے لیے کوشاں تھا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید برآں حضرت والا کی شب بیداری ریاضت اور قلت غذا، بایں ہمہ پیرانہ سالی اور پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جد و جہد کی ناکامی کا صدمہ ان تمام اسباب کی بنا پر گویا مرض کا سلسلہ مالٹا ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ تک راستے کی مشقت، اور ہندوستان پہنچنے کے بعد مخلوقات کا ہجوم، تحریک کی ترقی، مشاغل کی کثرت، یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں۔ انتہا یہ کہ آپ کو دق ہو گئی۔ مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی ہمت و استقلال، ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لیے سبق آموز ہے کہ تپ دق کا آخری اسٹیج ہے۔ چلنا پھرنا تو درکنار بیٹھنا بھی ممکن نہیں مگر اس حالت میں بھی تحریک کی قیادت جاری ہے۔ اجلاسوں کی شرکت کے لیے سفر ہو رہا ہے، صدارت فرمائی جا رہی ہے العظمۃ للہ، عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بستر مرگ پر ایک شیخ فانی کا یہ بے پناہ جذبہ عمل"۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے اس حالت میں تشریف لے گئے تھے کہ ڈولی میں پڑ کر جلسہ گاہ تک پہنچے تھے۔ چند منٹ بیٹھ کر بھی خطاب کرنا مشکل تھا۔ مختصر سا خطبۂ صدارت تھا، لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ ۱۸ تا ۲۰ نومبر کو دہلی میں جمعیۃ العلماء ہند کا دوسرا سالانہ جلسہ آپ کی صدارت میں تھا لیکن بیماری اور نقاہت کی وجہ سے آپ کے لیے اسٹیج پر تھوڑی دیر بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ خطبہ صدارت لکھا ہوا تھا اور کسی اور نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دہلی میں سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔ دہلی میں ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا اور مسلمان اس روح عظیم و مقدس کے وجود گرامی اور اس کی رہنمائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے

والسلام علیہ ورحمۃ اللہ

شیخ الہند کی جانب سے مولانا آزاد کی تائید

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم مولانا آزاد کی امامت کے لیے میدان ہموار کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی۔ اس کی روداد خود انہی کی زبانی سنیئے:

"شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے[1] اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ خبر ملی کہ فرنگی محل والے اس کوشش میں ہیں کہ مولانا عبدالباری صاحب کی امامت پر انہیں راضی کریں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود شیخ الہند کے بعض رفیق شیخ کے لیے یہ منصب چاہتے ہیں .... میں نے شیخ الہند سے تنہائی میں ملاقات کی۔ رسمی باتوں کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی امامت کا تذکرہ چھیڑا۔ شیخ نے فرمایا، امامت کی ضرورت مسلم ہے۔ عرض کیا حضرت سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ہوش مند، مدبر اور ڈپلومیٹ ہو۔ جس کی استقامت کو نہ کوئی تشویش متزلزل کر سکے نہ کوئی ترہیب .... شیخ الہند نے اتفاق ظاہر کیا تو عرض کیا آپ کی رائے میں اس وقت امامت کا اہل کون ہے؟ یہ بھی اشارۃً کہہ دیا کہ بعض لوگ اس منصب کے لیے خود آپ کا نام لے رہے ہیں اور بحمد اللہ اہل بھی ہیں۔ شیخ بڑی معصومیت سے مسکرائے اور فرمایا "میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں"[2] عرض کیا (باقی ص ۳۴)

---

[1] واضح رہے کہ یہ واقعہ جولائی یا اگست ۱۹۲۰ء کا ہے۔ [2] اس ایک جملہ میں حضرت شیخ الہند نے اپنی پوری سیرت بیان کر دی ہے۔ لاریب ان کا خلوص ان کی بے نفسی اور للہیت اسی درجے کی تھی، وہ پہلے بھی صرف مولانا آزادؒ کے اصرار اور ملت اسلامیہ کے دینی و سیاسی مصالح کے پیش نظر اور کسی کو آمادہ نہ پا کر ہی منصبِ امامت قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہوں گے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ تحریک کا کام شروع ہو چکا ہے اور مولانا آزاد اس کے لیے ہر طرح اہل اور آمادہ بھی ہیں تو فوراً خود کو اس سے الگ کر لیا اور مولانا آزاد پر اپنا اعتماد ظاہر فرما دیا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت شیخ الہند ذرا بھی اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تو سب سے پہلے مولانا آزادؒ ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے کہ ان کی ملی دردمندی بھی اسی درجے کی تھی۔ بہرحال یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند کے ہندوستان تشریف لے آنے کے بعد مولانا آزاد کے لیے بیعت امامت کا